ترجمے کا فن اور ادبی تراجم کے تقاضے

ڈاکٹر علی کاوسی نژاد، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف تہران

ABSTRACT:

Along with the scientific progress, translation made human mind to develop and the boundaries of human thoughts and imagination expanded. Also from linguistic point of view, translation contributes majorly in linguistic development. Translation brings forth new terminologies, vocabulary & words and broadens the horizon of a language. It nourishes a language in many ways and provides it with new terminologies and vocabulary. Science, technology, psychology, economics, history and in-depth theoretical subjects are presented through language. Translation also impacts the structure of a language and new ways for expressing emotions and feelings are developed. New idioms and adages find their way in the language and allow us to get familiar with new genres of poetry and styles of research. Various literary and theoretical translations were produced during Abbasid and Sassanid regimes and paved the way for different disciplines in Arabic and Persian. Translation enriched Arabic with multiple theoretical disciplines. Arabic became rich in terms of theory & literature and developed into an theoretical language. Even scientists like Avicenna preferred Arabic for writing their books. This study will discuss fundamentals of translation and will focus on essentials of Urdu Persian literary Translations.

Keywords: The art of translation, essentials of literary translation, the tradition of translation

لغت نامہ ءدہخدا میں ترجمہ کے لفظی معانی کچھ اس طرح بیان کیے گئے ہیں": گفتار یا نوشہ ای را، از زبانی بزبانی دیگر بر گرداندن، بیان کردن کلامی یا عبارتی را از زبانی بزبانِ دیگر"

(1) ترجمہ" : گفتگو یا تحریر کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا یا کسی کلام یا عبارت کو ایک زبان سے دوسری زبان میں بیان کرنا۔"

ترجمہ دراصل عربی لفظ ہے جو فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں مستعمل ہے۔ مظفر علی سیّد ترجمے کے لغوی معنی کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "۔۔۔اردو اور فارسی میں ترجمے کا لفظ جس کا اشتقاقی رابطہ ترجمان اور مترجم دونوں سے ہے، عربی زبان سے آیا ہے، اہل لغت اس کے کم سے کم چار معنی درج کرتے ہیں۔ ایک سے دوسری زبان میں نقل کلام، تفسیر و تعبیر، دیباچہ اور کسی شخص کا بیانِ احوال یا تذکرۂ شخصی یہ سب معانی باہم مربوط ہیں۔۔۔غالباً عربی کے جدید علما لفظ ''ترجمان'' کو اساسی کلمہ سمجھتے ہیں۔ یونانی لفظ Dragoman کی تعریب، اس طرح ترجمہ وغیرہ کو اشفاق معکوس یا Back Formation کیا جا سکتا ہے، ترجمے کو ''رجم'' سے منسوب کرنے میں بڑی دقت یہ ہے کہ اس کام کو گناہِ کبیرہ کے ساتھ کیوں مربوط کیا جائے اور بچارے مترجمین کو حدِ شرعی سے کیسے محفوظ کیا جائے''(۲)

لغوی معنی واضح کرنے کے بعد اب اصطلاحی معنی کی طرف آتے ہیں۔ ترجمہ دراصل دو تہذیبوں اور زبانوں کے مابین ایک پل کا کام دیتا ہے جس کے ذریعے ایک زبان اور کلچر کی خصوصیات دوسری زبان اور کلچر میں منتقل ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہم سب جانتے ہیں کہ اردو شاعری میں فارسی الفاظ و تراکیب کثرت سے استعمال ہوئی ہیں لیکن کچھ عرصے بعد یہ تراکیب والفاظ اپنے معانی بدل لیتے ہیں۔ اگر عام بول چال کی زبان میں دیکھیں تو کچھ ایسے الفاظ مل جاتے ہیں جو فارسی سے اردو میں آئے اور کئی برسوں بعد وہ الفاظ اپنے معانی بالکل زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ تبدیل کر چکے ہیں۔ مثال کے طور پر ''مورچہ'' کا لفظ آج کل کی فارسی زبان میں چیونٹی کے معنی میں آتا ہے لیکن اردو زبان میں یہ لفظ فوجیوں کی جائے پناہ کے معنی میں مستعمل ہے جسے فارسی میں آج کل ''سنگر'' کہتے ہیں۔

ترجمہ ایک ایسا عمل ہے جو ایک مترجم، مصنف کے اسلوب اور معانی کو مد نظر رکھتے ہوئے انجام دیتا ہے یعنی تخلیق کے بعد کا عمل ہے۔ اس میں مترجم اپنے تخیّل سے زیادہ کام نہیں لیتا لیکن اپنے تجربات اور مشاہدات کو ایک نئے سانچے میں ڈھال کر دکھاتا ہے۔ حاجی احمد فخری ترجمے کے اصطلاحی مفہوم پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہمارے نزدیک ترجمے کی تعریف یہ ہے کہ کسی مصنف کے خیالات کو لیا جائے ان کو اپنی زبان کا لباس پہنایا جائے ان کو اپنے الفاظ اور محاورات کے سانچے میں ڈھالا جائے اور اپنی قوم کے سامنے اس انداز سے پیش کیا جائے کہ ترجمے اور تالیف میں کچھ فرق معلوم نہ ہو''(۳)

حاجی احمد فخری آگے یہ بتاتے ہیں کہ اس تعریف میں شک و شبہ پایا جاتا ہے کیونکہ ترجمے اور تالیف میں ہمیشہ فرق محسوس ہوتا ہے اور مترجم اپنے فرض کو سو فیصد نہیں نبھا سکتا۔ یعنی جب مترجم آزاد ہو اور لفظ کی جگہ لفظ رکھ کر آگے چلا جائے تو اس کا کام ترجمہ نہیں رہے گا بلکہ لفظوں کا گورکھ دھندا بن جائے گا۔ آخر تصنیف اور ترجمے میں فرق ضرور ہونا چاہیے۔ اگر مترجم مصنف کے اسلوب اور معانی کو مد نظر رکھتے ہوئے آزادی کے ساتھ ترجمہ کرے تو اس کے کام کی نوعیت زیادہ قابل قدر ہو گی۔

ترجمہ اور ٹرانسلیشن:

ترجمہ اور اس کا انگریزی متبادل ٹرانسلیشن Translation کم و بیش یکساں اصطلاحی مفہوم کے حامل ہیں۔ لغوی پس منظر کے اعتبار سے دونوں کی معنوی جہات مختلف بھی ہیں اور مماثل بھی۔ جہاں تک لفظ ٹرانسلیشن (Translation) کا تعلق ہے، یہ لاطینی زبان سے آیا ہے اور اس کا مطلب ہے ''پار لے جانا'' یہ مفہوم نقل مکانی سے لے کر نقلِ معانی تک پھیلا ہوا ہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں ٹرانسلیشن کے مختلف معانی ذکر کیے گئے ہیں:

> "Translation: 1:Removal or conveyance from one person, place, time, removal to another...2:The action of process of expressing the sense of a word passage, etc, in a different language...3: transformation, alteration, change; changing or adapting to another use...4: A transfer of property; formerly...5:Transferenc of meaning; metaphor ....6:The automatic retransmission of a message by mean of a relay."(۴)

ترجمے کی روایت اور افادیت:

اگر تراجم کی تاریخ کو دکھایا جائے تو ساسانی دور میں سنسکرت کی کتاب ہتوپدش کے ایک حصے ''پنچ تنتر'' کا ترجمہ بزر گمہر اور حکیم برزویہ کی کوششوں سے (550ء) پہلوی زبان میں ''کلیک و دمنک'' کے نام سے ہوا۔

حکومت عباسیہ کے خلیفہ ابو جعفر منصور نے عجمیوں کو اپنے دربار میں جگہ دی۔ انھوں نے فارسی سے طب اور فلسفے کی کتابیں ترجمہ کیں، اس دور کا سب سے اہم مترجم عبداللہ بن المقفع تھا جس نے ''کلیک ودمنک'' کا عربی میں ترجمہ کر کے ''کلیلہ ودمنہ'' نام رکھا۔ فارسی سے ان کے کیے گئے تراجم ایرانی تاریخ کی نادر کتابیں ''آئین نامہ'' ''یزدک نامہ'' ''نوشیروان نامہ'' پر مشتمل ہیں۔

خلیفہ ہارون الرشید نے بیت الحکمت کی بنیاد رکھی اور اس دور کے دو بڑے فاضل مترجمین فضل بن نوبخت مجوسی اور یوحنا بن ماسویہ تھے جنھوں نے بالترتیب فارسی اور یونانی زبانوں سے ترجمے کیے۔ مامون الرشید کا زمانہ عربی میں تراجم کا سنہری دور کہا جاتا ہے، اس دور میں مناظرے بازی کے مقابلے میں علوم عقلیہ پر خصوصی توجہ دی گئی۔ یونانی مشاہیر کی کتابیں عربی زبان میں منتقل ہوئیں۔ اس امر سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں ترجمے کی کتنی قدر کی جاتی تھی۔ آج کل یونانی مشاہیر کی اصل کتابیں نہیں ہیں، عربی تراجم کو انگریزی زبان میں منتقل کرنے کے بعد ان کے افکار و آرا سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ ایران میں اکثر ترجمے عربی زبان سے کیے گئے اور فرانسیسی اثر کو بھی قبول کیا گیا۔ ''تاریخِ طبری'' کا ترجمہ وزیر محمد عبداللہ بلعمی نے 963ء میں کیا۔ طوسی کی کتاب ''اخلاقِ ناصری'' ابو علی مسکویہ کی کتاب ''تہذیب الاخلاق'' کا آزاد ترجمہ ہے۔

عباسی اور ساسانی ادوار میں علمی و ادبی تراجم ہوئے اور ان تراجم کے ذریعے مختلف علوم عربی اور فارسی زبانوں میں پھیلے۔ ترجمے کی بدولت عربی زبان مختلف علوم سے مالامال ہوئی، خصوصاً فلسفہ، طب میں خاص وسعت پیدا ہوئی۔ عربی زبان، لٹریچر اور علمت کے لحاظ سے باثروت ہو گئی اور یہ وہ علمی زبان بن گئی کہ بعد میں ابو علی سینا جیسے دانشور و عالم نے اپنی دو کتابیں ''قانون'' اور ''شفاء'' اس زبان میں تالیف کیں، یہ وہ دور تھا جب عربی زبان الفاظ، تراکیب اور اصطلاحات کے نقطہ نظر سے باثروت ہو گئی تھی۔

سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ ترجمہ انسانی ذہن کی نشو و نما کا باعث بنا اور انسانی سوچ کی حدیں بڑھ گئیں۔ اگر لسانی نقطہ نظر سے دیکھیں تو ترجمہ زبان کی لسانی افزائش کا باعث بنتا ہے۔ ترجمے کے ساتھ نئی اصطلاحات، تراکیب اور نئے نئے الفاظ بنتے چلے جاتے ہیں، اس سے زبان میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ ترجمے کے ذریعے زبان کئی طرح پھیلتی پھولتی ہے، اس میں نئے علوم کی اصطلاحات و تراکیب مستعمل ہوتی ہیں۔ سائنس، ٹیکنالوجی، نفسیات، عمرانیات، اکنامکس، تاریخ اور دقیق علمی مسائل بھی زبان ہی کے ذریعے بیان کیے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے تجربے اور مشق کی ضرورت ہے۔ ترجمے کا عمل زبان کی ساخت کو بھی متاثر کرتا ہے اور اس میں جذبات و احساسات کے اظہار

کے لیے نئے نئے اسلوب وضع کیے جاتے ہیں، نئے محاورات زبان میں وارد ہوتے ہیں اور نئی نئی اصنافِ سخن سے آشنائی کا موقع ملتا ہے، فکر و تحقیق کے لیے نئے سانچے اور نئے اسالیب مل جاتے ہیں۔

کچھ ایسی زبانیں ہیں جو سنگلاخ اور کرخت ہوتی ہیں جن میں گہرے جذبات اور احساسات سے بھرپور باتیں بآسانی ظاہر نہیں ہو پاتیں لیکن جب قدیم کلاسیک زبانوں سے استعارات، تشبیہات ایسی زبانوں میں داخل ہوتے ہیں تو جذبات و احساسات کو بھرپور طریقے سے ادا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اور شعری و نثری فن پاروں میں مصنف اور شاعر کے لیے بہت سے راستے کھل جاتے ہیں۔ پروفیسر جیلانی کامران ترجمے کی اہمیت و ضرورت پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ترجمہ اصل میں دو زبانوں اور دو تہذیبوں کے مابین پل کا کام دیتا ہے۔ جس کے ذریعے خیالات اور تصورات ایک تہذیب سے دوسری تہذیب کی طرف اور ایک ملک سے دوسرے ملک کی جانب جاتے ہیں"(5)

جدید فارسی زبان نے اپنی تشکیل اور محاوراتی سطح پر دوسری زبانوں سے خاص طور پر فرانسیسی زبان سے مدد لی ہے اور جنوبی امریکہ اور دوسرے ممالک کے ادیبوں کی اہم تخلیقات فارسی میں منتقل ہو چکی ہیں، اس لیے ہمیں جدید فارسی میں زیادہ گنجائش نظر آتی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو جدید فارسی افسانے کی تشکیل میں تراجم کا بہت اہم کردار رہا ہے، ان تراجم کے کے ذریعے ایرانی افسانہ نگاروں نے دوسرے ممالک کی تخلیقات کے افکار و احساسات سے آشنائی حاصل کی جس کے نتیجے میں نئے نئے محاورات اور تراکیب بیسویں صدی میں فارسی زبان میں استعمال ہونے لگیں۔ دراصل ترجمے کا ایک اور فائدہ یہ ہے کہ ہر تہذیب، دوسری تہذیب و تمدن سے کچھ نہ کچھ اخذ کرتی ہے اور اس تہذیب کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسری تہذیب کے رسومات اور ثقافتی و مذہبی تہواروں سے ایک رشتہ قائم کر لیتی ہے۔ جتنا ہم دوسری تہذیبوں سے اخذ و ترجمہ کریں گے اتنی ہماری معلومات ان تہذیبوں اور اقوام کے افراد کے بارے میں زیادہ ہوں گی اور اہم طریقے سے اس سرزمین سے اپنے تعلقات کو قائم و محفوظ بنا سکیں گے۔ چنانچہ ہم سب جانتے ہیں کہ اردو زبان نے کلاسیکی شعری روایت میں فارسی شعر و ادب سے بہت سی چیزیں مستعار لی ہیں، ہیئت، اصنافِ شعری، تراکیب، اصطلاحات، محاورات و ضرب الامثال اور مذہبی و اساطیری روایات ایرانی تہذیب سے لی گئی ہیں اور ان کے ذریعے دو تہذیبیں کافی حد تک قریب آئی ہیں۔ اس بات کے پیشِ نظر جو خلیج آج کل اردو فارسی کے مابین حائل ہے 1857ء کے بعد کی چیز ہے۔ جدید فارسی اپنے لہجے اور بوقلمونی کے اعتبار سے مغربی ادبیات سے بہت کچھ

اخذ کر چکی ہے، اب ترجمے کی ایک نئی روایت کی ضرورت ہے جو فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں حائل خلیج کو دور کرے اور اردو زبان کو دوبارہ جدید فارسی روایت سے آشنا اور مالا مال کرے۔

علمی و سائنسی علوم کے پھیلاء و اور ان علوم سے لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے ترجموں کی ضرورت ہے۔ سائنسی اصطلاحات و تراکیب جو اردو فارسی میں وضع کی جاتی ہیں ان سے زبان میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور لوگوں کو نئے علوم سے واقفیت ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ انگریزی اصطلاحات کو بعینہ اپنی زبان میں داخل کر لینا چاہیے لیکن یہ کام زبان کی ساخت کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے جبکہ نئی اصطلاحات بنانے سے نہ صرف زبان کا ذخیرہ الفاظ بڑھتا چلا جاتا ہے، بلکہ ایسا کرنے سے ہمیں مستقبل میں نئے علوم پر کتابیں تصنیف کرنے کے سلسلے میں الفاظ و اصطلاحات کی کوئی کمی محسوس نہیں ہو گی۔

بڑے شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کی آفاقی شناخت تراجم کے ذریعے ہوئی۔ خیّام، اقبال، ٹیگور، کالی داس وغیرہ کی عظمت کا اعتراف ترجموں کی بدولت ہی ہوا ورنہ دنیا اور ان ہستیوں سے کیسے آشنا ہوتی؟

ترجمے کی متعدد صورتیں:

عام طور پر ترجمے کی تین صورتیں ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ترجمے کے تین طریقے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ترجمے کے تین طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اصل متن کا صرف لفظی ترجمہ کر دیا جائے اور بس (اسے ترجمہ کرنا نہیں کہتے، مکھی پر مکھی مارنا کہتے ہیں) دوسرا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ مفہوم لے کر آزادی کے ساتھ اپنی زبان کے روایتی و مقبول اندازِ بیان کو سامنے رکھتے ہوئے ترجمہ کیا جائے۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ترجمہ اس طور پر کیا جائے کہ اس میں مصنف کے لہجے کی کھنک بھی باقی رہے۔ اپنی زبان کا مزاج بھی باقی رہے اور ترجمہ اصل متن کے بالکل مطابق ہو۔ ترجمہ کی یہ شکل سب سے زیادہ مشکل ہے۔ ایسے ترجموں سے زبان و بیان کو ایک فائدہ تو یہ پہنچتا ہے کہ زبان کے ہاتھ، بیان کا ایک نیا سانچا آجاتا ہے دوسرے، جملوں کی ساخت ایک نئی شکل اختیار کر کے اپنی زبان کے اظہار کے سانچوں کو وسیع کر دیتی ہے"(۶)

یوں جمیل جالبی کی باتوں کے پیش نظر ترجمے کے تین طریقے ہو سکتے ہیں:

(الف) لفظی ترجمہ یا تحت اللفظ ترجمہ:

اس ترجمے میں مترجم اپنی زبان میں دوسری زبان کے مترادفات تلاش کرتا ہے اور مصنف کے اصل فن پارے کو بغیر کسی رد و بدل کے اپنی زبان میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن اس ترجمے میں مترجم اصل فن پارے یا نظم کی تاثیر و کیفیت کو منتقل کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی مترجم غالب کے فارسی مکتوبات کا جن میں کافی تشبیہات، استعارات اور متعدد اضافات موجود ہیں لفظی ترجمہ کرے تو اس میں غالب کی فارسی نثر جیسی کیفیت برقرار نہیں رہ سکتی چونکہ غالب کے فارسی مکتوبات میں شعری کیفیت اور غالب کی بے مثال تخلیقی صلاحیتیں نظر آتی ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس منظوم نثری قصرِ طلسمات کے قفلِ ابجد کھلنے کے لیے لفظی ترجمہ بے کار ہے اور ان کی فارسی نثر نگاری میں چھپی ہوئی شعری صلاحیتوں کو ظاہر کرنے کے لیے تخلیقی صلاحیت اور کاوش کی ضرورت پڑتی ہے، ایسا مترجم جو خود ان خطوط کی نثری خوبیوں سے واقف اور اس میں انتہا درجے کی تخلیقی صلاحیت موجود ہو جس کی مدد سے وہ نثر کی کیفیت کو برقرار رکھتے ہوئے غالب کے ان شاہکار مکتوبات کو اردو میں منتقل کر سکے۔

(ب) آزاد یا بامحاورہ ترجمہ:

اسی ترجمے میں مترجم اصل الفاظ و عبارات کے لفظی مترادفات کی تلاش نہیں کرتا بلکہ اصل متن میں چھپے ہوئے تاثر اور کیفیت کو بیان کرتا ہے۔ متن میں موجود خیال، تاثر اور کیفیت کو منتقل کرنے کا یہ عمل ایک طرح سے فن پارے یا نظم کا نچوڑ ہے جس میں مترجم پوری آزادی کے ساتھ مفہوم کی منتقلی کے عمل سے گزرتا ہے۔ مبدا اور مقصد زبانوں کے روز مرہ محاورات اور ضرب الامثال میں فرق ہوتا ہے۔ اس لیے ہمیں مختلف ضرب الامثال اور محاوروں کو منتقل کرتے ہوئے اس بات کا پورا خیال رکھنا چاہیے کہ مقصد زبان میں کون سے محاورے اور ضرب الامثال مستعمل ہیں۔ مثال کے طور پر فارسی زبان میں ایک ضرب المثل ''یک کلاغ چہل کلاغ کردن'' ہے۔ ظاہر ہے کہ اس ضرب المثل کا لفظی ترجمہ نہیں کیا جا سکتا، اس کا اصلی معنی و مطلب اس وقت درست بیان ہو سکتا ہے کہ مترجم دونوں زبانوں کے ثقافتی اور تہذیبی پس منظر سے واقف ہو ورنہ اسے مذکورہ ضرب المثل منتقل کرنے میں غلطی ہو گی۔ ''یک کلاغ چہل کلاغ کردن'' کا متبادل ضرب المثل اردو زبان میں ''بات کا بتنگڑ بنانا'' ہے۔ یوں دونوں زبانوں کے متبادل محاوروں اور ضرب الامثال سے واقفیت ایک ادبی مترجم کی خصوصیات اور فرائض میں شامل ہے۔

(ج) تخلیقی ترجمہ:

تخلیقی ترجمے کا زیادہ تر رجحان ادبی فن پاروں اور شعری تصانیف میں نظر آتا ہے جس میں مترجم اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بدولت منشا مصنف کو مد نظر رکھتے ہوئے اس میں تخلیقی شان اور کیفیت برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ غالب کے فارسی مکتوبات میں ان کے فن انشا نگاری اور تخلیقی ذہن کے آثار نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ دور از ذہن استعارات اور تشبیہات کی فراوانی نے ان کی فارسی نثر کو مبہم اور بعض صورتوں میں غیر قابل فہم بنایا ہے، اس مشکل اور دقیق نثر کو اردو زبان میں منتقل کرنے کے لیے مترجم کو بہت محنت اور دیدہ ریزی سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ ہماری نظر مترجم کی تخلیقی صلاحیتوں پر بھی ہونی چاہیے کہ وہ کس حد تک اس فارسی نثر کو اردو کے پیکر میں ڈھالنے میں کامیاب نظر آتا ہے۔

تخلیق اور ترجمہ میں فرق تو ضرور ہے مگر کیا ترجمہ ایک تخلیقی عمل بھی ہو سکتا ہے؟ مصنف خود تخلیق کے مرحلے سے گزرا ہے اور اب مترجم ان الفاظ کو نئے سانچے میں ڈھالنے اور منتقلی کے عمل سے گزر رہا ہے۔ تخلیق میں مصنف اپنے تجربات اور مشاہدات کو یکجا کر کے تخلیقی عمل سے گزرتا ہے، بے شک اس کی قوتِ متخیلہ میں وہ مواد اور لوازمات قوتِ مشاہدہ سے حاصل ہوئے ہیں اور مواد و مشاہدات کی ترتیب و تنظیم متخیلہ میں ہوتی ہے اور مصنف لکھنے پر قادر ہوتا ہے۔ بے شک مترجم بھی ایک تجربہ کار شخص ہوتا ہے اور اس کی قوتِ مشاہدہ دور رس ہے ہر ایک لفظ پر اس کی نظر ہوتی ہے اور الفاظ کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کا کام بھرپور طریقے سے اپنی قوتِ متخیلہ کی مدد سے کرتا ہے، اس کی انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ الفاظ زیادہ پیچیدہ اور دقیق نہ ہوں جن کے پڑھنے میں قاری کو دقت محسوس ہو۔ ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ایک اعلیٰ اور معیاری ترجمہ تخلیقی نوعیت کا عمل ہے اور ترجمہ ایک تصنیف کی از سرِ نو بازیافت و دریافت ہے۔

اچھے مترجم کی صفات و خصوصیات:

ترجمہ ایک ایسا فن ہے جس کے لیے مترجم کو اپنے اندر خاص خصوصیات و صفات کی پرورش کرنی اور تربیت دینی چاہیے، لیکن کیا ہر شخص ترجمے میں صلاحیت اور قابلیت رکھتا ہے؟ مترجم کے لیے خاص وصف یہ ہے کہ اس میں ذاتی صلاحیت اور استعداد موجود ہو اور تخلیقی صلاحیت اس وقت وجود میں آتی ہے کہ وہ ایک وسیع المطالعہ شخص ہو او

رجس موضوع سے متعلق ترجمہ کر رہا ہے اس موضوع سے اس کی گہری دلچسپی ہونی چاہیے۔ بہت سے ایسے مترجمین ملتے ہیں جو معاشی ضرورت کے تحت ترجمہ کرتے ہیں لیکن کافی عرصے بعد بھی ترجمے کے اصول و قواعد سے بڑی حد تک بے خبر ہوتے ہیں۔ دراصل ترجمے کے لیے مترجم کی تربیت و پرورش اہم بات ہے۔ جس موضوع کو وہ ترجمہ کر رہا ہے کیا وہ ذاتی طور پر اُس موضوع کو پسند کرتا ہے یا کہ اپنی معاشی ضرورت کی بنا پر ترجمہ کر رہا ہے کوئی بھی شخص اپنے اند رجب توانائی اور قابلیت طویل مشق کے بعد پیدا کر لے تو اُس وقت ترجمے کے عمل سے یکسوئی کے ساتھ گزر سکتا ہے۔

مترجم میں کونسی صفات لازمی ہیں اور وہ کب ایک اچھا مترجم بن سکتا ہے؟ اس موضوع کے حوالے سے آگے اچھّے مترجم کی خصوصیات و شواہد پر بحث کریں گے۔ مترجم کے لیے پہلا وصف جو ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس میں تخلیقی صلاحیت موجود ہو یعنی وہ ضرورت کے موقعے پر اچھّی اور مناسب تراکیب اور الفاظ تخلیق کر سکے جو شخص شاعر ہے اور وہ شاعری کا ترجمہ کرتا ہے، بے شک اس کا ترجمہ زیادہ معیاری اور پر کشش ہو گا کیونکہ اس شخص کے ذہن میں تخلیقی صلاحیتیں بالقوہ موجود ہیں اور شاعری کی نزاکتوں اور باریکیوں سے باخبر اور اوازانِ شعری پر واقفیت رکھتا ہے۔ تخلیقی صلاحیت کے بعد مترجم جتنی صفات اپنے اندر پیدا کر سکتا ہے وہ اس کی محنت و مشقت پر مبنی ہے۔ زیادہ مہارت، قابلیت، محنت اور جہد مسلسل ایک اچھے مترجم کی خصوصیات میں شمار ہوتی ہیں۔

مطالعہ وہ اصل ہے جو ہر حاذق اور اچھے حافظہ رکھنے والے مترجم کی نشاندہی کرتا ہے۔ مترجم اپنے موضوع سے متعلق کتابوں کے مطالعے کے علاوہ اُس دور کی تصانیف اور تاریخ اور مصنف کے سوانحِ زندگی پر نظر رکھتا ہے۔ مصنف کی کتابوں کا مطالعہ مترجم کے لیے یہ سامان مہیا کرتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ مصنف کے گوشہء افکار اور اس کے اسلوب نگارش سے آگاہ ہو جائے۔ مترجم اپنے افکار، جذبات، اسلوب سبھی مصنف کے افکار، جذبات اور اسلوبِ نگارش کے مطابق کر لیتا ہے اور یہ نفیِ ذات کے عمل سے عبارت ہے، یعنی اپنی ذات مصنف کی ذات میں محو کرتا ہے۔ یہ اصل میں ''من تو شدم'' کے مصداق ہے نہ کہ ''تو من شدی'' کے۔ ترجمے کے بنیادی اصول بیان کرتے ہوئے ظ۔ انصاری رقمطراز ہیں:

> ''ترجمہ کرنے والے کے اصل کی نقل میں ایک مصنف اور اداکار کی طرح مصنف کے ساتھ ہلاک ہونا پڑتا ہے اس کے ساتھ تالیاں بجانا، قہقہے لگانا اور کراہنا پڑتا ہے اور یہ سب کر لینے کے باوجود یوں سنبھل سنبھل کر قدم اُٹھانا پڑتا ہے جسے طوطا اداوں پر چلتا ہے، تب جا کر ترجمہ ایک آرٹ بنتا ہے اور تخلیقی ترجم حاصل کرنے کے قریب پہنچتا ہے۔''(۷)

ڈاکٹر ظ۔ انصاری کے اس بیان سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ ہر مرحلہ و مقام پر مترجم خود کو مصنف کی شخصیت میں ضم کرنا ہے اور اس کے عادات و اطوار کو بخوبی سمجھ کر ایک طوطے کی طرح نقالی اور نقاشی کرنی ہے۔ لیکن ترجمہ لفظی نہیں ہونا

چاہیے، عبارت کا صحیح مفہوم سمجھ کر اُسے بخوبی اپنے ذہن میں تجزیہ و تحلیل کر کے ایک ایسا متبادل جملہ لکھنا چاہیے جس کے ذریعے ترجمے کا حق ادا ہو جائے۔ نہایت غور و خوض اور دیانتداری سے اصل کی نقل کی ایسی صورت تشکیل دینی ہے جس میں کسی قسم کا ابہام پیچیدگی، مفہوم اور الفاظ کی ساخت و نگارش میں موجود نہ ہو تب مترجم اپنا فرض پوری دیانتداری کے ساتھ نبھائے گا۔

بے شک ہر شخص اُسی وقت ترجمہ کرنے پر قادر ہو سکتا ہے کہ دونوں زبانوں پر یعنی مبداء و مقصد پر اس کا عبور ہو اور الفاظ کے معانی اور تراکیب، استعارات، کنایات، تلمیحات، روزمرہ و محاورات کی سمجھ بوجھ کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس وقت ایک سوال یہ اٹھتا ہے کہ مترجم کو کس زبان میں زیادہ مہارت حاصل ہونی چاہیے، ظاہر ہے کہ وہ جس زبان میں ترجم کر رہا ہے اُسی میں اُس کو زیادہ ماہر ہونا چاہیے کیونکہ جس زبان میں ترجمہ ہو رہا ہے اس کے الفاظ، محاورات اور اس کی ساخت سے بخوبی واقفیت ہونی چاہیے کیونکہ سطحی اور سرسری واقفیت کی بنیاد پر کوئی بھی ترجمہ کرنے پر قادر نہیں ہوتا۔ چنانچہ سب جانتے ہیں کہ الفاظ کے لفظی اور مجازی معانی و مفاہیم ہوتے ہیں۔ اصطلاحات سازی میں مترجم کو اس علم سے اس قدر واقفیت رکھنی ہوتی ہے کہ ہر اصطلاح کے لیے اُس کے حافظے میں ایسی اصطلاح موجود ہونی چاہیے جو اصل کی پوری نمائندگی کر سکے۔ سائنسی موضوعات کے تراجم وہ اشخاص کر سکتے ہیں جنھیں ان خاص علوم میں مہارت اور دسترس حاصل ہو۔

مترجم کو اپنے عصری، سیاسی و معاشرتی حالات اور تبدیلیوں سے بخوبی واقف ہونا چاہیے کیونکہ عصری حالات، تصانیف کی تشکیل اور مصنف کے افکار کی رونمائی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ مصنف کی شخصیت کی تشکیل اور اس کے اسلوبِ تحریر پر یہ حالات و واقعات موثر طریقے سے اثرانداز ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہر موڑ پر مترجم کو اُس دور کے حالات اور واقعات سے باخبر ہونا چاہیے جس میں مصنف سانس لیتا ہوا زندگی بسر کرتا ہے۔ تاریخی حوادث اپنی نوعیت کے اعتبار سے تاحد امکان ایک تصنیف کی تشکیل میں بھرپور طریقے سے اثرانداز ہوتے ہیں اور عصری حالات کی روح تصانیف کی روح بن کر رہ جاتی ہیں۔ خیال اور مفہوم کی پوری ادائیگی ترجمے میں ضروری ہے۔ مترجم کو لفظوں کی منتقلی کے سلسلے میں ایک اور چیز مدنظر رکھنی چاہیے اور وہ یہ ہے کہ کیا مصنف کے خیالات اور افکار کی پوری طرح ادائیگی ہو گئی ہے کہ نہیں؟ لفظوں کی منتقلی خود ایک غرض و غایت نہیں بلکہ خیال اور مفہوم کو اچھّے الفاظ میں منتقل کرنا اصل اہم بات ہے، مترجم کو اپنے ترجمے میں اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ کیا مصنف کے جملوں کے بین السطور کی منتقلی اچھی طرح سے ہوئی ہے؟ بین السطور کا مفہوم یہ ہے کہ جملوں میں جو خیال اور مفہوم مضمر ہے کیا وہ مترجم کے قلم اور ترجمے کے ذریعے منتقل ہو رہا ہے یا فقط لفظ کی جگہ لفظ رکھا جا رہا ہے۔

خیال اور مفہوم کی ادائیگی کے سلسلے میں جو بات اہم ہے وہ یہ ہے کہ کچھ اصطلاحات ادب میں خاص معانی و مفاہیم رکھتی ہیں اور معاشیات اور سائنسی علوم میں کچھ اور معانی رکھتی ہیں، ہر لفظ خاص عبارت میں اپنا الگ معنی رکھتا ہے۔ مصنف اپنے الفاظ و اصطلاحات کی مدد سے کچھ خاص معانی ادا کرنا چاہتا ہے اور کچھ ایسے الفاظ ہیں جو اس کے یہاں علامت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں، ہر لفظ کے پیچھے ایک خاص تہذیبی و تمدنی معنی بھی وجود رکھتا ہے، ناول اور افسانے میں خاص طور پر الفاظ پرانے اور

نئے معانی لیے ہوئے استعمال ہوتے ہیں۔ مترجم کو ہر اُس لفظ سے واقف ہو ناچاہیے جسے مصنف اپنے یہاں علامت اور استعارے کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ ہماری داستانوں میں جو فضا اور تصویر کشی کی گئی ہے، ان کہانیوں میں مافوق الفطرت عناصر شامل ہیں اور آج کل کی افسانوی فضا تجریدی نظام کا دور ہے اور اردو ادب میں انتظار حسین وغیرہ کے افسانوں کی فضا ایک علامتی اور تجریدی نظام پر استوار ہے۔

مذہبی لحاظ سے دیکھا جائے تو مترجم کو رواداری اور غیر جانبداری سے کام لینا چاہیے، اگر مصنف خاص رجحان یا مذہبی سوچ کا نمائندہ ہے تو اُسے چاہیے وہ بغیر کسی تعصب ور مذہبی جانبداری کے ترجمہ کرے اور اگر کچھ فقرے اس کی مذہبی سوچ کے خلاف ہیں انھیں حذف یا رد نہ کرے بلکہ حواشی میں اختلاف کی صورت میں اپنی رائے کا اظہار کرے کیونکہ اگر کوئی جملہ یا لفظ ترجمے سے حذف ہو گیا تو دراصل مصنف کے ساتھ یہ مترجم کی ناانصافی اور بد دیانتی ہے۔ مسلک اور مذہب کی بنا پر اختلاف ایک فطری بات ہے لیکن کیا مترجم اس حد تک مصنف کے ساتھ زیادتی کر سکتا ہے کہ جو جملے اس کی سوچ کے خلاف ہیں ان کو اپنے ترجمے سے خارج کر دے یا کوئی اور معنی و مفہوم کو منتقل کرے؟ یہاں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مترجم انصاف اور حد درجے کی رواداری اور غیر جانبداری سے کام لے ورنہ اس کے کام کی نوعیت زیادہ محنت کے باوجود غلطی کی وجہ سے درجہ اعتبار سے ساقط ہو جائے گی اور اُس پر ناانصافی کی چھاپ لگ جائے گی۔

نفاست، پاکی اور صداقت مترجم کی اپنی روز مرہ زندگی میں پہلے سے شامل ہو تب وہ ایک نفیس، پاک اور سچائی سے بھرپور ترجمہ پیش کر سکتا ہے جب مترجم میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کی کمی ہو، کیا وہ ایک بے نقص اور اعلیٰ ترجمے کا اہل ہو سکتا ہے؟ اخلاقی اقدار اور معاشرے کی اچّھی صفات و خصوصیات کو اس انداز سے اپنے اندر جذب کرے کہ اس کی جھلک اس کے ترجمے میں موجزن ہو۔

ادبی تراجم کے تقاضے:

ادبی تراجم: الف) نثری ترجمہ۔ ب) منظوم ترجمہ:

الف) نثری ترجمہ

ادبی تراجم کو ہم دو ذیلی اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں نثری اور منظوم تراجم۔ ہم عام طور پر ان تصانیف اور فن پاروں کا نثری ترجمہ کرتے ہیں جو نثر میں لکھی گئی ہوں۔ مثال کے طور پر علمی اور سائنسی کتب، معاشی و معاشرتی، سیاسی و ادبی کتب اور مکتوبات کا براہِ راست نثری ترجمہ کیا جا سکتا ہے، ایران میں فارسی زبان کئی صدیوں سے تعلیم کی زبان رہی ہے اور غیر ملکی مصنفین کی جو کتب ہمارے نصابات میں شامل رہی ہیں ان کا سلیس اور رواں فارسی اسلوب میں ترجمہ کیا جاتا ہے۔ اس لیے ایرانیوں کو ہمیشہ سے نثری تراجم سے واسطہ پڑا ہے اور کئی محققوں ادیبوں اور دانشوروں نے اس ضمن میں اپنی فنی، علمی اور ادبی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے، حتیٰ کہ قرآن پاک کے کئی ترجمے فارسی زبان میں لکھے گئے ہیں، ان کے علاوہ قرآن اور احادیث کی تفصیل سے تفسیریں تحریر کی گئی ہیں۔ اب نثری تراجم اور قومی زبان فروغ دینے کے لیے مختلف ادارے بنائے گئے ہیں جن کی

اصل ذمہ داری قومی زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ اور اجنبی اور نامانوس الفاظ کے متبادل فارسی الفاظ کی تلاش ہے، ان اداروں میں ''فرہنگستان زبان فارسی'' و ''شورای گسترش زبان فارسی'' اور ''موَسسہ دہخدا'' سر فہرست ہیں۔

نثری تراجم کے لیے نئے الفاظ اور اصطلاحات وضع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چونکہ علمی، سائنسی دور میں انگریزی زبان کی نئی اصطلاحات وضع کی جاتی ہیں جن کی متبادل اصطلاحات دوسری زبان میں مفقود ہیں، اس لیے ایک ایسا ادارہ یا سوسائٹی قائم کرنے کی بڑی اشد ضرورت ہوتی ہے، فارسی کی نئی اصطلاحات وضع کرنے کے لیے ''فرہنگستان زبان فارسی'' قائم کی گئی ہے جن کے بنیادی فرائض میں نئے الفاظ اور تراکیب و اصطلاحات کی وضع ہے، فارسی زبان میں عربی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں کے الفاظ بھی مستعمل ہیں جو روزمرہ اور محاورے کی زبان میں عام طور پر استعمال ہوتے ہیں، یہ الفاظ فارسی کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ مسلمانوں کی فتحِ ایران کے بعد عربی زبان اور اسلامی ثقافت و تمدن نے فارسی زبان اور ایرانی معاشرے پر اپنا اثر رسوخ دکھایا اور الفاظ آہستہ آہستہ عربی زبان سے کوچ کر گئے اور فارسی زبان میں یوں جذب ہو گئے جو کئی صدیوں کے گزرنے کے باوجود ہم ان الفاظ سے اجنبیت محسوس نہیں کرتے اور اپنی بول چال میں بھی آسانی اور سہولت کے ساتھ انھیں استعمال کرتے ہیں۔

مسلمانوں کے دور میں علم و ادب کی زبان عربی رہی اور ایرانی سائنس دانوں اور دانشوروں اور ادیبوں نے اپنی تصانیف عربی زبان میں بھی تحریر کیں۔ بوعلی سینا کی دو کتابیں ''قانون'' اور ''شفا'' دونوں عربی زبان میں تحریر ہوئیں اور کئی عرصے تک ایران اور دنیا کی تمام یونیورسٹیوں میں طب اور فلسفے کے طالب علم ان سے مستفید رہے۔ البتہ یہ بات ذہن میں رہے کہ بیرونی حملہ آوروں کی آئی ہوئی عربی زبان کے خلاف پہلا ردعمل جو ایرانی ادبیات میں سامنے آیا وہ ابوالقاسم فردوسی کی شاہکار تصنیف ''شاہنامہ'' ہے جس میں فردوسی نے اپنا یہ عزم دکھایا کہ عربی الفاظ استعمال کرنے سے اجتناب کریں اور ٹھیٹھ فارسی زبان میں ایرانی بادشاہوں اور پہلوانوں کی قصہ کہانیاں نظم کریں، ہمارے خیال کے مطابق فردوسی وہ واحد عظیم شاعر ہیں جنھوں نے فارسی زبان کے فروغ اور اس کی از سرنو بازیافت کی تحریک چلائی ورنہ آج فارسی زبان کا صرف نام ہی رہ جاتا، فردوسی سے پہلے اور بعد کی صدیوں میں ایرانی شاعروں اور ادیبوں نے فارسی ادبیات کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا، عربی زبان و ادب سے فارسی میں کئی تراجم ہوئے اور یوں فارسی زبان نے اپنی عظمت رفتہ کی پھر سے دریافت کی، ہر چند ایرانی ادیبوں اور شاعروں نے مختلف اصنافِ ادب میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منگوایا لیکن اس بات کو ہرگز نہیں بھولا جا سکتا کہ مترجمین نے بھی اس ادبی اور ثقافتی ورثے کی حفاظت کے عزم سے سرشار فارسی زبان کی خدمت کی اور آج فارسی زبان کی اتنی قدر اور منزلت ہے جتنی قدیم دور کی۔

عربی زبان و ادب کے علاوہ دوسری مغربی زبانوں سے نثری تراجم کی تحریک جو انیسویں صدی میں ایران میں شروع ہوئی وہ بھی اپنی جگہ لائق توجّہ ہے جس کی مدد سے مغربی دنیا کی شاہکار تصانیف اور افسانے فارسی زبان کی دنیا میں وارد ہوئے۔ فارسی زبان مختلف مغربی اسالیب اور زبانوں سے جو ایک عظیم سائنسی، ادبی اور لسانی دولت تھی مالا مال ہو گئی۔ جب ہم آج کی

فارسی اور ماڈرن زبان پر گہری نظر ڈالتے ہی توہ میں ایک نیا اسلوب اور نئی لسانی لچک محسوس ہوتی ہے، رفتہ رفتہ زبان تاریخ کے مختلف ادوار سے گزرتی ہوئی تبدیلی سے ہم کنار ہوتی ہے۔ اس نئی تبدیلی کی بنیاد دوسری زبانوں اور مختلف تہذیبی، ثقافتی قدروں سے مستعار لیے گئے الفاظ، اصطلاحات پر مبنی ہے، یعنی زبان اور کلچر دوسری زبانوں سے کچھ چیزیں اخذ کرتی ہے اور ارتقا کی منزلیں طے کر لیتی ہے۔ ہمارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ زبان میں لسانی اور تہذیبی سطح پر جو تبدیلی سامنے آتی ہے وہ دراصل دوسری زبانوں اور دوسرے ممالک کے تہذیبی ورثے سے متاثر ہونے کے باعث پیش آتی ہے۔ اس نئی تبدیلی کا ایک اہم ذریعہ نثری اور ادبی تراجم ہیں۔

نثری تراجم علم، ادب، سیاست، معاشرت مختلف شعبوں میں جاری و ساری ہے۔ دوسرے ممالک کے تجارب اور علوم و فنون سے استفادہ کرنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ ہم ان ممالک کی زبانوں سے پوری واقفیت حاصل کر سکیں یا ان کی زبان کو باقاعدگی سے سیکھیں۔ لیکن ایک معاشرے کے تمام لوگ دنیا میں بولی جانے والی تمام زبانوں سے بیک وقت واقفیت حاصل نہیں کر سکتے، اس لیے ہا یسے ہمیں مترجمین اور ماہرین کی ضرورت ہوتی ہے کہ ایک یا دو سے زیادہ زبانوں کے کسی خاص اور متعین دائرے میں رہتے ہوئے ہماری زبان اور تہذیب کی خدمت کریں اور اپنے تراجم کے ذریعے ہمارے علمی اور لسانی ذخیرے میں اضافے کا باعث بنیں۔ نثری تراجم کے ذریعے زبان اور ادب کے علاوہ دوسرے شعبوں میں بھی بڑی خاصی تبدیلی آتی ہے چونکہ دوسری زبانوں سے ترجمہ کرتے ہوئے نئے الفاظ اور مفاہیم حتیٰ کہ نئی اصطلاحات وضع کرنے کے باعث زبان میں تحرک اور تبدیلی آئے گی۔

ہم نہ صرف داستانوں، افسانوں اور تنقیدی رسائل و کتب کا نثری ترجمہ کر سکتے ہیں بلکہ جہاں منظوم تصانیف منظوم ترجمے کی متحمل نہیں ہو سکتیں اور مترجم خود موزوں طبع نہیں ہوتا اور اوزان و بحور سے ان کی اتنی واقفیت نہیں ہوتی کہ وہ منظوم فن پاروں کا منظوم ترجمہ کر سکے تو اسی صورت میں مترجم نثری سانچے میں تصانیف منتقل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس منثور تراجم میں جو کمیاں رہ جاتی ہیں وہ یہ ہے کہ ہر چند مصنف کے افکار، خیالات اور اشعار کے مفاہیم و مطالب منتقل کیے جا سکتے ہیں لیکن موسیقیت، نغمگی اور شاعر کے اندر موجزن احساسات و جذبات نثر کے پیکر میں نہیں سما سکتے۔ اس کے علاوہ بعض ایسی شاہکار نثری تصانیف بھی موجود ہیں جن میں مصنف کے اعلیٰ جذبات اور اس کے نادر استعارات و تشبیہات کی فراوانی کے باعث نثری ترجمے کی بدولت منتقل نہیں ہو سکتے۔ اس ضمن میں ایک ایسے مترجم کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے اندر احساسات، جذبات اور شعری و نثری صلاحیتیں بیک وقت موجود ہوں اور مصنف کے اسلوب کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے راستے کی ناہمواریوں اور مصائب بہ آسانی طے کر سکے۔ اس باب میں غالب کے فارسی خطوط کی مثال پیش کی جا سکتی ہے جن میں مرزا غالب کے عالی دماغی، ظرافت اور ان کی شعری اور نثری صلاحیتیں ساتھ مل کر ایک ایسی شاہکار نثر سامنے آتی ہے کہ قاری اسے پڑھ کر بے حد لطف اور مزا پاتا ہے۔

در حقیقت مرزا غالب اپنے سے پہلے گزرے ہوئے بڑے فارسی مکتوب نگاروں کی جاری روایت کی پیروی کرتے ہیں ۔نازک خیالی، فارسی و عربی کے مشکل الفاظ و تراکیب، مختلف لفظی و معنوی صناءع و بدائع کے استعمال نے فہم سخن کو مشکل اور عرض مدعا کو طوالت اور زیادہ گوئی کی وجہ سے ناقص اور ادھورا بنادیا ہے۔ نثر میں مشکل طرز تحریر، دوراز کار استعارے، مشکل تراکیب والفاظ کے استعمال نے مفہوم کی ادائیگی کو مشکل بنایا ہے۔ ہمیں بہت کم ایسے خطوط ملیں گے جن میں مرزا غالب مختصر انداز میں مکتوب الیہ کو مخاطب قرار دیتے ہوئے اپنے مدعا کا اظہار کیا ہو۔ عرضِ مدعا سے پہلے ہر شخص کو مختلف النوع القابات سے نوازتے ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ مرزا غالب نے فارسی مکتوب نگاری کی اس روایت کو آگے بڑھایا جو ان سے پہلے برصغیر کی فارسی مکتوب نگاری کی روایت تھی اور اس میں پر تکلف زبان اور مشکل و دقیق الفاظ و تراکیب کے استعمال کا رجحان تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ فارسی مکتوب نگاری میں مستعمل مشکل تراکیب والفاظ ان کی مدعانگاری اور مکالمہ نگاری کے راستے میں حائل نظر آتے ہیں۔ پر تو روہیلہ اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ غالب نے ''سرہ نویسی'' کی کوشش کی ہے اور فارسی ادب میں نئے الفاظ اور تراکیب واستعارات کا اضافہ کیا ہے اور وہ اس بات پر یقین دلاتے ہیں کہ ابوالفضل علاّمی کے بعد فارسی میں غالب وہ پہلے شخص نہیں جنھوں نے سرہ نویسی کی کوشش کی ہے بلکہ غالب سے پہلے اور ان کے بعد بہت سارے لوگوں نے اس میدان میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔

غالب نے اپنی فارسی خطوط نگاری میں رعایتِ لفظی، سجع، تجنیس، ابہام، مراعاۃ النظیر، تضاد اور دیگر بے شمار لفظی و معنوی صناءع کا استعمال کیا ہے۔ ہر چند یہ خصوصیات ان کی نثر کی خوبصورتی کو دوبالا کرتی ہیں لیکن فہمِ سخن عبارت کی طوالت اور مرکبات واضافات کی وجہ سے مشکل ہو جاتا ہے۔ روانی وسلاست کے راستے میں یہ صنائع وبدائع حائل نظر آتے ہیں۔ لفظی و معنوی صناع وبدائع کی بوقلمونی کے علاوہ ایک خصوصیت ان خطوط میں جو ہمیں خاص طور پر نظر آتی ہے وہ فارسی عبارات میں انگریزی الفاظ واصطلاحات کا استعمال ہے۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جس کی موجد غالب جیسی نامور شخصیت ہے جن کی تخلیقی صلاحیت کی بنا پر غالب فارسی وانگریزی الفاظ کی ترکیب سے نئے نئے الفاظ و تراکیب بناتے ہیں۔ یہ ان کی جدت طرازی اور تخلیقی حسیت پر مبنی ہے۔ ان تراکیب کے استعمال سے غالب نے اپنے ماقبل نثر نگاروں اور مکتوب نویسوں کی روایت شکنی کی ہے۔ وہ فارسی، اردو، انگریزی الفاظ کی مدد سے نئے الفاظ و تراکیب اپنی مراسلہ نگاری میں شامل کرتے ہیں۔ غالب نے اپنے مقدمۂ پنشن کے سلسلے میں حکام بالا کے ساتھ اپنی مراسلہ نگاری کے ضمن میں ان تراکیب کا استعمال کیا۔ چند نمونے آپ کے پیش نظر رہیں۔

رزیڈنٹ دہلی، بریدانِ ڈاک انگریزی، کوٹھی رسیڈنٹی، صاحبانِ سکرٹر، اجنٹی لبسبیل ڈاک، عرضی دستخطی کونسل، ڈاک کدہ، صاحب ڈاک، اہالی ڈاک، رسید ڈاک، بی دستخط رجسٹری، صاحب سکرتر، اعیانِ ڈاکم، پیادگانِ ڈاک، پوسٹ ماسٹر، مجسٹریٹ دہلی وغیرہ۔

فارسی خطوط میں متواتر اضافات و مرکبات استفادہ کرنے کے باعث پیچیدگی ہ میں محسوس ہوتی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ جدید طرزِ تحریر اور نیا اسلوب اور عبارات کے قوافی ہ میں اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔اپنی منفرد خصوصیات کی بنا پر غالب اپنے ہم عصر نثر نگاروں اور فارسی مکتوب نویسوں میں ایک نئے اسلوب کے حامل نظر آتے ہیں۔

ایک خط بنام منشی فضل اللہ خاں میں غالب جو تمہید باندھتے ہیں۔اس میں متعدد اضافات اور استعارات و تشبیہات کی فراوانی موجود ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''ابرِ بہار اگر بہ کشایش فراوانی دستگاہ ھمہ گوہر شاہوار آفریند، کشتِ کشاورز سرسبزی و باغ کدیور شادابی از کجا بیند، ھمچنین پرتوِ مہر اگر در نمایشِ نیروی تصرف جز بہ مغزِ خاک راہ نبرد، دانہ را در خوشہ و میوہ را بر شاخ کہ پرورد۔لاجرم خامہ کہ میانجی بی زبانان است و زباندانِ راز دانان، اگر جز بذلہ نداند نگاشت، گزارشِ مافی الضمیر سخنور از کہ چشم توان داشت۔۔۔''
>
> (۸)

اس فارسی نثر میں ہ میں لطافت، رنگینی اور رعنائی نظر آتی ہے۔یوں لگتا ہے کہ غالب نے شعری پیکر میں نظم کے تمام اوصاف سموئے ہیں، ان الفاظ کی رنگینی اور نادرہ کاری صرف ایک اعلیٰ تخلیقی صلاحیت رکھنے والے نثر نگار کے اوصاف میں شمار ہوتی ہے۔ورنہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں جو الفاظ اور تراکیب کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ ملا کے ایسی شاہکار نثر تخلیق کرے۔ان تمام اوصاف کے باوجود بعض لوگوں کے لیے یہ نثر ثقیل اور بھاری بھر کم لگتی ہے اور اسی نثر کو اردو جیسی زباں میں منتقل کرنے کے لیے ایک ایسے ماہر اور تجربہ کار مترجم کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ نثری ترجمے کے رموز سے آشنا ہوتے ہوئے تخلیقی صلاحیتوں سے آراستہ ہو۔غالب کے فارسی مکتوبات کے اردو سانچے میں ڈھالنے کے لیے کئی مترجمین نے بڑی کاوشیں دکھائی ہیں، لیکن جس مترجم نے باقاعدگی سے ان فارسی خطوط کو اردو منتقل کرنے میں کئی برس گزارے وہ پرتو روہیلہ ہیں جن کی محنت اور دیدہ ریزی اس بات کی گواہ ہے کہ وہ غالب کی نثر اور ان کے افکار و احساسات سے رمز آشنا ہیں اور ان کے اسلوبِ فکر اور جذبے کو منتقل کرنے کے بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔اب مذکورہ بالا خط کا ترجمہ ملاحظہ کیجیے جس میں پرتو روہیلہ نے اپنی مہارت اور تخلیقی جوہر کا ثبوت فراہم کیا ہے:

> ''اگر ابرِ بہار اپنی دسترس کی فراوانی کی وسعت کے باعث صرف گوہر شاہوار ہی تخلیق کرے تو کاشتکار کو سرسبزی اور مالی کے باغ کو شادابی کہاں سے نصیب ہو۔اسی طرح نورِ آفتاب اگر اپنی کارگزاری کی طاقت کی نمائش میں بجز مغزِ خاک کے (کسی دوسری جانب) نہ جائے (تو) دانہ کو خوشہ میں اور میوہ کو شاخ پر کون پرورش کرے۔چنانچہ قلم کہ بے

زبانوں کا قاصد ہے اور رازدانوں کا زبان دان، اگر لطاءف کے علاوہ اور کچھ لکھنا نہ جانتا ہو تو
کسی سخنور کے مافی الضمیر کے بیان کی امید کس سے رکھی جاسکتی ہے۔۔۔"(۹)

پرتو روہیلہ نے اپنے ترجمے میں بڑی حد تک کوشش کی ہے کہ غالب کے اسلوب اور ان کی نثر کی رنگینی کو قائم رکھے۔ اس لیے انھیں بعض الفاظ جو اردو زبان میں بھی مستعمل ہیں اور ادبی زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں شمار کیے جاتے ہیں بعینہٖ منتقل کرنے کا جواز ملا ہے چونکہ اردو دان طبقہ خود ان الفاظ سے ناآشنا نہیں ہے۔ ''گوہر شاہوار''، ''نورِ آفتاب''، ''مغزِ خاک'' و ''دانہ''، ''خوشہ''، ''میوہ'' ایسے الفاظ ہیں جو اردو کی نثری روایت میں ہ میں نظر آتے ہیں۔ شاید یہ الفاظ عام بول چال اور اردو محاورے میں استعمال نہ ہوں لیکن ان خطوط کے قاری سبھی وہی لوگ ہیں جو اردو فارسی ادب سے واقف ہیں، اگر غالب کے ان الفاظ کو مترجم منتقل نہ کرے تو وہ غالب کے نثری اسلوب اور ان کے ہاں موجود جذبات اور شعری کیفیات کو کس طرح منتقل کر سکتا ہے؟ درحقیقت ہم پرتو روہیلہ کے اس نثری ترجمے کے لیے یہ جواز فراہم کر سکتے ہیں کہ انھیں غالب کے نثری اسلوب کو منتقل کرنے کے لیے مذکورہ بالا الفاظ و تراکیب کا سہارا لینا پڑے گا۔ یہ غالب کے ان نثری فن پاروں میں شمار کیے جاتے ہیں جو آج تک ہمارے ادیبوں اور دانشوروں خاص طور پر اردو فارسی ادبیات کے مترجمین نے کم تر توجہ دی ہے اور غالب شناسی کے باب میں یہ ایک نیا اضافہ ہے۔ غالب کے فارسی خطوط کے یہ تراجم ابھی بھی جاری و ساری ہیں اور رفتہ رفتہ دریافت شدہ خطوط کے تراجم سامنے آرہے ہوتے ہیں، اگر ان خطوط کے لیے ایک فارسی اردو لغت (فرہنگ) تیار کر لی جائے تو قارئین بہتر طریقے سے ان خطوط کی لطافت، رنگینی سے محظوظ ہو سکیں گے۔

ب) منظوم ترجمہ:

کئی منظوم تخلیقات کو شعری صورت میں یا کہ نثری شکل میں ترجمہ کیا جاتا ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا منظوم اور شعری تخلیق کا منظوم ترجمہ کیا جاسکتا ہے؟ ترجمے کے لیے کس قسم کی صلاحیت درکار ہونی چاہیے؟ ترجمہ کرتے وقت کونسی مشکلات پیش آئیں گی؟ بے شک ہر کوئی شاعری کا ترجمہ کرنے کا اہل نہیں ہو سکتا، یہ کام وہ شخص کر سکتا ہے جو شعری اور منظوم تخلیقات کی باریکیوں سے رمز آشنا ہو اور اس کے مطالعے کا دائرہ کار وسیع ہو۔ شعری باریکیوں میں اوزانِ شعری، صوتیات، استعارات و تشبیہات، محاورات کی صحیح سمجھ بوجھ، ہیئت اور شعری نزاکتوں سے بخوبی آشنائی اور مترجم کے اندر تخلیقی صلاحیت کی طاقت کا ہونا ضروری ہے، ممکن ہے کہ کوئی شعر کا ترجمہ تو کر سکے لیکن اگر وہ لفظ کی جگہ لفظ رکھ کر یہ کام بھی کر لے تو کیا اُس ترجمے کی کوئی قدر و منزلت ہو سکتی ہے؟ یہ بجائے خود ایک اہم بات ہے کہ جو شاعری کا ترجمہ کرنے والا ہے اُس میں وہ صلاحیت موجود ہونی چاہیے کہ اوزانِ شعری و بحور اور دوسری خصوصیات کی بطور خاص تمیز کر سکے۔

مغرب و مشرق کی تاریخ پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ بائبل و قرآن پاک کے تراجم پہلے عبرانی اور عربی زبان سے ہوئے۔ سنہ 1618ء میں ایک ترجمہ بائبل سے ہوا اور عبرانی زبان سے انگریزی میں یہ ایک ایسا ترجمہ ہے جو عبرانی زبان کی خصوصیات اور نزاکتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے کیا گیا۔ چنانچہ ہم سب اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ قرآن پاک عربی زبان میں خاص صوتیات پر مبنی ہے اور پہلے یہ تصور تھا کہ قرآن کا ترجمہ نہیں ہو سکتا اور ترجمے میں بڑی بڑی غلطیاں ہوں گی۔ برصغیر میں شاہ عبدالقادر (رح) وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے قرآنِ پاک کا ترجمہ کیا، انھوں نے اس خوبی کے ساتھ ترجمے کا اہتمام کیا کہ اب تک ان کے ترجمے کی خوبیاں زدِ عام و خاص ہیں۔ قرآن و بائبل کے جو ترجمے کیے گئے وہ نثری تراجم تھے۔ لیکن ان نثری تراجم میں بھی اصل زبانوں کی صوتیات کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمہ قرآنِ پاک ایک ایسا ترجمہ ہے جس میں محاوراتی زبان کا خیال کیا گیا ہے لیکن کیا یہ محاوراتی لب و لہجہ قرآنِ پاک کی اصل روح کی شان اور مرتبے کے مطابق ہے؟ پھر ہمیں مقدس کتب کے ترجمے میں اس بات خاص خیال رکھنا چاہیے کہ ترجمے میں ان کتب کی عظمت و قدر کو برقرار رکھیں تاکہ قاری پر گراں نہ گزرے۔

ہماری اردو فارسی ادبیات میں مغربی ادب کے بہت سے تراجم ہو چکے ہیں اور ہماری ادبیات مغربی زبانوں میں بھی منتقل ہو چکی ہے، یہ تراجم نثری اور منظوم تراجم پر مشتمل ہیں۔ رباعیات خیام کا ترجمہ فٹس جیرلڈ کا شہرہء آفاق ترجمہ ہے جو فارسی سے انگریزی میں کیا گیا ہے۔ خیام کے افکار اور شعری روایت کا پھیلاؤ اس کے ذریعے ہوا۔ فٹس جیرلڈ نے خیام کو متعارف کرانے کا عمل انجام دیا ورنہ آج کوئی بھی اس ادبی شخصیت سے واقف نہ ہوتا۔ رومی، سعدی، حافظ، غالب، اقبال اور دوسری بہت سی ادبی شخصیات کی تصانیف انگریزی زبان میں ترجمہ ہوئیں اور ان تراجم کی وجہ سے ان ہستیوں کی دنیا میں شہرت ہوئی۔

مشرق کے ادب اور معاشرے پر مغربی ادیبوں کی بڑی اور دوررس نظر تھی اور اس سلسلے میں نکلسن وہ ادیب ہیں جو رومی اور اقبال پر خاص نظر رکھتے ہیں۔ میراجی نے مغربی ادبیات سے تراجم کیے، اس سلسلے میں میراجی نے فرانس کے تخیّل پرست شاعر میلارمے کی نظموں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ محمد حسن عسکری کا خیال ہے میراجی نے بہت بہادری سے کام لیا کیونکہ فرانسیسی زبان کی صوتیات کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے متبادل صوتیات موجود نہیں ہیں، چنانچہ ہم جانتے ہیں اردو اضافتوں کی وجہ سے جو سادگی و روانی اصل شاعری میں موجود ہے وہ باقی نہیں رہتی۔ مشکل یہ ہے کہ شاعری کے منظوم ترجمے میں بہت سی مشکلات سامنے آتی ہیں۔ شاعری کو دوسری زبانوں میں منتقل کرنے میں چند باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ پہلی بات یہ ہے کہ اُسے شعری روایت اور معاشرے کے سیاسی و ثقافتی و تہذیبی امور سے مکمل طور پر واقف ہونا چاہیے، اگر مترجم معاشرے کی عصری صورتحال سے بے خبر ہو تو وہ کیسے اُس معاشرے کی تہذیبی اقدار کو مدنظر رکھتے ہوئے ترجمہ کرے گا۔ ہر ملک کی تہذیب و تمدن میں خاص خاص محاورے یا ایسی روایات موجود ہیں جو اس معاشرے کے بطن میں شامل ہیں۔ جب مترجم ان امور سے ناآشنا ہو اس سے بہت سی فاش غلطیاں سرزد ہوں گی۔ مثال کے طور پر نکلسن نے اقبال کی اسرار خودی کا ایک شعر یوں ترجمہ کیا ہے۔:

تابہ کی دریوزہ منصب کنی
صورتِ طفلانِ زِنی مرکب کنی (اقبال)

نکلسن نے اقبال کے شعر کے دوسرے مصرع میں زِنی کو ''زنی'' پڑھا اور اس کا یوں ترجمہ کیا: "And vide Like Children on a Woman's back"

دراصل نکلسن کو اُس وقت پتا نہیں چلا کہ ''نے سواری'' ایک ایسا کھیل ہے جو برصغیر میں لڑکے ایک ''نے'' کو گھوڑے بنا کر گھوڑ سواری کا خیالی کھیل کھیلتے ہیں۔ یہاں یہ بات واضح ہوتی کہ منظوم یا منثور ترجمے کے دوران مترجم معاشرے کی روایات سے بخوبی واقف ہو ورنہ وہ اپنے ترجمے میں ٹھوکریں کھائے گا اور نکلسن جیسے بڑے دانشور و ادیب سے غلطی کا امکان بھی ہو سکتا ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ مترجم کو اس دور کی زبان و نحویات و گرامر سے آشنائی ہونی چاہیے اور اُس دور کی چند کتب اور تخلیقات کا مطالعہ ضروری ہے یا خود مصنف کی دوسری تصانیف اس کی نظر سے گزرنی چاہیں تاکہ وہ اس دور کی زبان کی ساخت، املا، تراکیب و اصطلاحات سے بخوبی آشنا ہو۔ کئی ایسے الفاظ ہیں جو زمانے کے ساتھ ساتھ اپنے معانی بدلتے رہتے ہیں اور ان کے قدیم معانی آج کل استعمال نہیں ہوتے یا کوئی لفظ فارسی میں ایک خاص معنی میں مستعمل ہے اور اردو میں دوسرا معنی رکھتا ہے۔

تیسری بات جو مترجم کو اپنے ترجمے میں خاص طور پر ملحوظ رکھنی چاہیے، مصنف یا شاعر کی نفسیات اور اُس کی شخصیت کے پہلوؤں سے آشنائی ہے۔ ہر مصنف اور شاعر کی نفسیات دوسرے شاعر یا ادیب سے مختلف ہے، جو تاثرات اپنے معاشرے اور ماحول سے قبول کر لیتا ہے وہ بے شک ایک جیسے نہیں ہوتے، شاعری، شاعر کے اپنے افکار و جذبات اور مشاہدات کا نتیجہ اور اسی کی شخصیّت کا ایک آئینہ ہے اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں علمِ نفسیات کی رو سے ہر شعر یا فن پارے میں مصنف کی شخصیت کی جھلکیاں ضرور نظر آئیں گی۔ بالآخر مترجم کو شاعری ترجمہ کرتے وقت اس امر کا اہتمام کرنا چاہیے کہ مصنف کے مخفی پہلوؤں سے رمز آشنا ہو تاکہ وہ اپنے ترجمے کو اشتباہات اور پیچیدگیوں سے بچا سکے۔

چوتھی اہم بات یہ ہے کہ منظوم ترجمہ کرنے والوں کو شعری رموز سے آشنائی ہونی چاہیے۔ اوزانِ شعری، قوافی و ردیف، استعارات، تشبیہات، محاورات کا بخوبی اندازہ لگانا اور اپنی زبان میں ان محاورات و تراکیب کے لیے صحیح محاورے اور تراکیب ڈھونڈنا ضروری ہے۔ لہٰذا منظوم ترجمے میں اوزانِ شعری کی غلطیوں سے دوری اختیار کرنی چاہیے۔ جب کوئی مترجم منظوم ترجمے کی نزاکتوں اور باریکیوں سے رمز آشنا نہ ہو تو وہ اپنے منظوم ترجمے میں کئی مشکلات کا سامنا کرنے پر مجبور ہو جائے گا اور شاعری کی قدر و قیمت اپنے اصلی معیار اور مرتبے سے کئی گنا نیچے گر جائے گی، یہ شاعر کے ساتھ، ناانصافی اور بددیانتی کی انتہا ہے۔

شاعری کو ترجمہ کرتے وقت نفسِ مضمون سے بھی واقف ہونا چاہیے اور مطلب و مفہوم کا خوبصورت اندازِ میں ادا کرنا ایک ادبی ترجمے کی خوبصورتی ہے۔ ہر شاعر کی شاعری کا ترجمہ ممکن نہیں ہو سکتا، مثال کے طور پر بائرن اور کیٹس انگریز شاعر ہیں لیکن انگلستان کے ادبی حلقے اس امر سے پریشان تھے کہ بائرن کے تراجم مغربی زبانوں میں موجود ہیں لیکن کیٹس کے تراجم دکھائی نہیں دیتے۔ غور و فکر کے بعد پتا چلا کہ کیٹس کی شاعری ترجمے کی گرفت سے باہر ہے۔ بائرن اور کیٹس کی شاعری میں نمایاں فرق یہ ہے کہ بائرن کی زبان بیانیہ اور شفاف ہے جب کہ کیٹس کی شعری زبان استعاراتی اور اس کی امیجری زبان کے بطن سے پھوٹتی ہے۔ استعارہ شعری زبان کے لسانی پیکر میں ضم ہو جاتا ہے اور ترجمہ کرتے وقت زبان کی ایک جہت کو اہمیت دی جاتی ہے جو شاعری کے مافیہ سے بے تعلق ہوتی ہے اس لیے غالب جیسے شاعروں کی شاعری کا ترجمہ کرنا آسان کام نہیں ہے۔

ڈاکٹر جانسن کا خیال ہے کہ نظم کا ترجمہ نہیں ہو سکتا، اس میں کوئی شک نہیں کہ نظم کی تمام خوبیوں کو منتقل کرنا مشکل ہے اور جب ہم اردو سے انگریزی میں نظموں کا ترجمہ کرنا چاہیں اوزانِ و بحور، استعارات، تلمیحات تشبیہات کو آسانی سے منتقل نہیں کر سکتے۔ مثال کے طور پر غالب کے فکر و فلسفے کو انگریزی میں منتقل کرنا آسان کام نہیں، غالب کے اشعار کی شرحوں میں بھی ہمیں فرق نظر آتا ہے اور مترجم جب ترجمہ کر رہا ہوتا ہے اس کے سامنے چند مختلف النوع شرحیں ہوتی ہیں اور اگر غالب اپنے کلام کی پہلی غزل کی تشریح نہ کرتے تو آج پتا نہیں کیا معانی و مفاہیم شارحیں اس غزل سے نکالتے۔ ایک اور بات یہ ہے کہ ہر شعر میں وہ استعارات اور تشبیہات موجود ہیں جن کے ذریعے شعر کا اثر بخوبی منتقل ہو جاتا ہے۔

اگر ہم اردو غزل کی روایت کا مطالعہ کریں اس میں وہ سماجی تصورات موجود ہیں جو فارسی غزل سے مستعار لیے گئے ہیں، اردو اور فارسی میں پیرِ مغاں، ساقی، مغ بچہ، زاہد، رند وغیرہ لفظی معنوں میں استعمال نہیں ہوئے بلکہ ان کے پس منظر میں سماجی تصورات موجود ہیں۔

جب دونوں زبانوں میں کوئی چیز مشترک نہ ہو کام مشکل نظر آئے گا۔ مثلاً اردو نظم کا انگریزی ترجمہ پیش کرنا ہو تو انگریزی بحر کا انتخاب کرنا ہو گا اور وہ اردو بحر سے مختلف ہو گی اور یہ وہ مقام ہے جہاں مترجم کو مشکلات درپیش ہوں گی۔ نثری ترجمے میں الفاظ اور معانی منتقل ہو جاتے ہیں لیکن شعر کی موسیقیت اور صوتی تاثرات اُسی طرح جو شعر میں ہیں منتقل نہیں ہو پاتے لیکن ایک فائدہ یہ ہے کہ مترجم کو ترجمہ کرتے وقت بحور اور اوزانِ شعری کا پابندی نہیں کرنی پڑتی اور وہ پوری آزادی کے ساتھ اپنا کام سرانجام دے سکتا ہے۔

منظوم تراجم کے لیے مترجم کا شاعر ہونا ضروری ہے کیونکہ اس صورت میں وہ شعری تلازمات، بحور اور اوزانِ شعری، استعارات اور علامتوں سے بخوبی واقف ہو گا اور اگر زیادہ باصلاحیت شاعر ہو گا تو اس کا ترجمہ اصل نظم سے بھی بہتر اور مفید ہو گا۔

فٹس جیرلڈ کی شہرت کا دارومدار عمر خیّام کی رباعیات کے ترجمے پر ہے۔ خیّام کی رباعیات کے ترجمے کے بارے میں جی ایف مین نے لکھا ہے:

> ''''فٹس جیرلڈ نے عمر خیّام کا اتنا ترجمہ نہیں کیا جتنا کہ رباعیات کے شاعرانہ حسن اور خوبصورتی کو اپنے خیالات میں سمویا اور یہ کام اس قدر مہارت اور حسن کے ساتھ کیا گیا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے انگریزی ترجمہ اصل سے بہت بہتر ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس نے متن کے ترجمے میں بہت آزادی سے کام لیا ہے''(۱۰)

یہ ترجمے کی تعریف نہیں ہے۔ دراصل ترجمے کے بارے میں ایک ہجو ملیح ہے۔ چنانچہ ہم جانتے ہیں ترجمے میں مترجم کو کوئی حذف، اضافہ ترمیم کی اجازت نہیں اور وہ اپنی طرف سے کوئی لفظ کم یا زیادہ نہیں کر سکتا۔ اگر کسی لفظ یا علامت کی زیادہ تشریح کی ضرورت محسوس ہو تو حواشی و تعلیقات میں یہ کام آسانی اور بغیر کسی رکاوٹ کے کیا جا سکتا ہے۔

اردو میں منظوم تراجم کی روایت نظم طباطبائی کی ''گور غریباں'' سے شروع ہوئی۔ یہ ترجمہ عبدالحلیم شرر کی فرمائش پر کیا گیا اور پہلی بار جولائی 1897ء کے رسالہ دلگذار میں شائع ہوا اور اس کے بعد جب مخزن کا پہلا شمارہ 1901ء میں شائع ہوا، اس کا نصب العین انگریزی نظموں کا بامحاورہ ترجمہ کرنا تھا۔

مغرب اور مغربی ادب کی طرف توجہ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد زیادہ محسوس ہوئی اور اردو ادب کے دانشور طبقے میں مغربی ادب سے آشنائی کی شمعیں روشن ہوئیں۔ اگر بدرستی کہا جائے مغربی ادب نے اردو ادبیات کو بہت کچھ دیا اور اس میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔ مرزا حامد بیگ ادبی تراجم پر بات کرتے ہوئے مغربی ادبیات سے ترجمہ اور اخذ و استفادہ کا یوں بیان کرتے ہیں:

> ''اردو میں مغربی زبانوں سے تراجم کا جائزہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اردو زبان و ادب کی وسعت اور گہرائی اور گیرائی میں اخذ و ترجمے کا خاصا اہم کردار رہا ہے مثلاً یہ کہ ادبی تراجم نے نئے اسالیب بیان کو جنم دیا، نئے طرزِ احساس کو ابھارا، پیرایہ بیان میں صلابت، متانت اور استدلال پیدا کیا اور پیرایہ اظہار کے نئے نئے سانچے فراہم کیے۔ نیز یہ کہ نئی نئی اصنافِ سے آشنا ہی نہیں کیا بلکہ ان اصناف کو فنی وقار بخشا۔ اردو ادب میں تذکرہ کی جگہ تنقید، داستان اور تمثیل کی جگہ ناول، رہس اور نوٹنکی کی جگہ ڈرامے اور کہانی کی جگہ افسانے جیسی جدید اصناف نے لے لی اور ادبیات عالم کے ساتھ قدم بہ قدم چلنے کا خواب ہم نے پہلی بار دیکھا۔ یہ محض ہیئت کی سطح پر ہی تبدیلیاں نہ تھیں بلکہ مضمون کے ساتھ ادبی رویے کی

تبدیلیوں بھی تھیں اور قدامت پرستی کی زنجیروں سے آزاد ہو کر نئے زمانے میں سانس لینے کا جتن بھی"(۱۱)

حوالہ جات

(1)دہخدا، علی اکبر۔ لغت نامہ دہخدا۔ تہران: انتشاراتِ مجلسِ شورای ملی، 1335ھ ش۔ ص560

(2)مظفر علی سید۔ "فن ترجمے کے اصولی مباحث"۔ مشمولہ، اردو زبان میں ترجمے کے مسائل۔(مرتبہ: اعجاز راہی)اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، 1986ء، صص33-34

(3)حاجی احمد فخری۔ "دورِ تراجم"، مشمولہ، ترجمہ: روایت اور فن۔(مرتبہ: نثار احمد قریشی)اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، 1985ء، صص40-41

(4) Shorter Oxford English Dictionary. New York: Oxford University Press, Vol-2,2007,PP3325

(5)جیلانی کامران۔ "ترجمے کی ضرورت" مشمولہ، ترجمہ: روایت اور فن۔(مرتبہ: نثار احمد قریشی)اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، 1985، ص26

(6)جمیل جالبی، ڈاکٹر۔ مشمولہ، ترجمے کا فن۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، 1987ء، ص119

(7)ظ۔ انصاری، ڈاکٹر۔ "ترجمے کے بنیادی مسائل" مشمولہ، ترجمہ کا فن اور روایت (مرتبہ: ڈاکٹر قمر رئیس)۔ علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 2004، ص82

(8)پرتو روہیلہ۔ کلیاتِ مکتوباتِ فارسی غالب۔ اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، 2008، ص75

(9)ایضاً۔ ص۲۲۲

(10) خلیل انجم، ڈاکٹر۔ فنِ ترجمہ نگاری۔ اشاعتِ سوم، نئی دلّی: انجمن ترقیِ اردو (ہند)، 1996ء، صص 141-142

(11) مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر۔ ''اردو زبان میں ادبی تراجم کا جائزہ'' مشمولہ، اردو زبان میں ترجمے کے مسائل۔